اسلامی
حکومت کے
مصادر قوت

باسمہ سبحانہ

اسلامی حکومت کے مصادر قوت

اسلامی حکومت کے پاس وہ کونسی

بے پناہ قوت ہے جو پسماندگی کو فنا کر کے

اجتماعی ارتقاء کی تعمیر نو کر سکتی ہے

تحریر

شہید رابع السید محمد باقر الصدر طاب ثراہ

ترجمہ

السیّد ذیشان حیدر جوادی

باسمہ سبحانہ

ایران میں اسلامی انقلاب کی تحریک کے بعد ہی سے ذہنوں میں یہ خیال اور زبانوں پر یہ اشکال گردش کر رہا ہے کہ دور حاضر کے تمام صاحبان طاقت و قوت اور ارباب اقتدار و اختیار کے ناکام ہو جانے کے بعد اسلام کے پاس وہ کون سی قوت ہے جس کے بھروسہ پر پسماندگی اور زبوں حالی کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ اور معاشرہ کی ایک ایسی تشکیل کی جا سکتی ہے جسے صحیح معنوں میں ترقی یافتہ انسانی معاشرہ کہا جا سکے۔

استاد شہید آقائے صدر طالب ثراہ نے اسی اشکال کا جائزہ لیا ہے اور ان تمام قوتوں کی نشاندہی کی ہے جس کی بنا پر اسلام تعمیر نو کا فریضہ انجام دے سکتا ہے اور اسلام کے علاوہ کوئی اس کام کو انجام نہیں دے سکتا۔

کتاب نہایت مختصر ہے لیکن معنویت کے اعتبار سے کوزہ میں سمندر ہے۔ ارباب علم و ادب اور صاحبان ذوق تحقیق کو نظر غائر سے کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیئے اور اس کے بعد تفصیلات پر غور کرنا چاہیئے۔

والسلام

ذیشان حیدر جوادی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلامی حکومت کا مسئلہ کبھی اس اعتبار سے زیر بحث آتا ہے کہ یہ ایک شرعی ضرورت ہے اور ایک اسلامی فریضہ ہے کہ روئے زمین پر اللہ کی حکومت قائم کی جائے اور انسان کی خلافت کو مجسم شکل میں پیش کر دیا جائے۔

اور کبھی اس اعتبار سے زیر بحث آتا ہے کہ اس کے اجتماعی اور تمدنی اثرات کیا ہیں اور دیگر معاشرتی تجربات کے مقابلہ میں اس حکومت میں عمل کی کس قدر قوتیں پائی جاتی ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں اسی دوسرے رُخ کو زیر بحث لایا گیا ہے اور یہ واضح کیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت صرف ایک مذہبی فریضہ نہیں ہے بلکہ ایک تمدنی ضرورت بھی ہے۔ یہی حکومت ایک تنہا راستہ ہے جس کے ذریعہ انسانی طاقتوں کو بروئے کار لایا جا سکتا ہے اور انسان کو اس کے حقیقی مرکز تک پہنچایا جا سکتا ہے اور نتیجہ میں عالم انسانیت کو افتراق و بربادی اور غلامی سے آزاد کرایا جا سکتا ہے۔

اس حقیقت کو واضح کرنے کے لئے اسلامی حکومت کے امتیازات کو دو اہم موضوعات کے تحت پیش کیا جائے گا۔

۱۔ اسلامی حکومت کا عقائدی مزاج اور اس کے امتیازات۔

۲۔ مرد مسلم کا عقائدی اور نفسیاتی مزاج اور عالم اسلام۔

۱۔ اسلامی حکومت کی عقائدی ترکیب

و۔ حکومت کی عقائدی ترکیب اور مقصد سیر تکامل۔

دنیا میں ہر باہوش حرکت کے لیے ایک مقصد ضروری ہے اور ہر تمدنی تحریک کے لیے ایک ہدف لازم ہے جس کو حاصل کرنے کے لئے قدم آگے بڑھائے جائیں اور یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ ہدف و مقصد جہاں ظہور کے اعتبار سے سب سے آخر میں سامنے آتا ہے وہاں اپنے تصور کے اعتبار سے حرکت کے لیے محرک اور تحریک کے لیے ایندھن کا کام دیتا ہے تحریک دھیرے دھیرے مقصد کو ہضم کرتی رہتی ہے۔ یہ اور جب سارا مقصد مکمل ہو جاتا ہے تو تحریک خود بخود ختم ہو جاتی ہے اس لیے کہ مقصد ہی ایک ایندھن تھا جو حصول کے بعد ختم ہو گیا اس کی زندہ مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کوئی مخصوص علمی درجہ یا ڈگری حاصل کرنا چاہتا ہے تو یہی درجہ انسان میں تحصیل علم کی تحریک پیدا کرے گا اور جیسے جیسے انسان ڈگری سے قریب ہوتا جائے گا مقصد ہضم ہوتا جائے گا اور جیسے ہی ڈگری حاصل ہو جائے گی علمی تحریک خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اس لیے کہ جب تک کوئی نیا مقصد سامنے نہیں آئے تحریک کے لئے کوئی مزید ایندھن باقی نہیں رہ گیا۔

یہی حال اجتماعات اور معاشروں کا ہے کہ وہ اپنی تحریک میں جس مقصد کو بھی اپنا لیتے ہیں۔ وہی مقصد محرک بھی ہوتا ہے اور وہی قوت کا سرچشمہ بھی ہوتا ہے۔ پھر جیسے ہی وہ مقصد حاصل ہو جاتا ہے تحریک ختم ہو جاتی ہے اب اگر مقصد محدود ہے تو حرکت بھی محدود ہو گی۔ اور ایک دن تغیر و تصور اور ایجادات کی تمام قوت ختم ہو جائے گی اور وہ مقصد کے وجود کے ساتھ ہی تمام تحریکات فنا ہو جائیں گی اور مقصد لامحدود ہے تو تحریک کے ساتھ حرکت کا سلسلہ باقی

رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخی مادیت انسانی تغیرات میں اپنے جدلیاتی قوانین کی بنا پر سیر تکامل کے مخصوص تصورات کی بنا پر عجیب وغریب مشکل سے دوچار ہوگئی۔ اس کا خیال تھا کہ تاریخی حرکت اور انسانی رفتار کا مقصد ایک غیر فکری اور غیر شعوری مقصد ہے اور وہ صرف پیداواری قوتوں سے موانع کو برطرف کر دینا اور شخصی ملکیت کا خاتمہ کر کے اجتماعی معاشرہ کا قائم کر دینا ہے جیسا کہ مارکسیت نے اعلان کیا ہے ـــــ اور اس اعلان کا مطلب یہ ہے کہ جس وقت اشتراکی معاشرہ قائم ہو جائے گا انسان کی حرکت موقوف ہو جائے گی۔ اور معاشرہ مزید آگے نہ بڑھ سکے گا سیر تکامل کی آخری حد اشتراکی معاش ہے اور بس۔

نظامِ تقسیم سے وسائل پیداوار کو آزاد کر دینا ایک محدود مقصد ہے۔ یہ مقصد اگر تاریخ کا محرک بنایا گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وسائل پیداوار کے آزاد ہوتے ہی تاریخ کی حرکت رک جائے گی اور انسان کی تمام تخلیقی طاقتیں فنا ہو جائیں گی اور ان کا سرچشمہ خشک ہو جائے گا۔

حالانکہ انسانی تمدن کی تحریک کا ہدف اور مقصد ایسا ہونا چاہیئے جس سے انسان ہمیشہ قریب ہوتا رہے اور قریب کے بعد نئے آفاق کی روشنی حاصل کرے اور ایک نئے غیر محسوس عالم کا مشاہدہ کرے تاکہ سیر تکامل مسلسل جاری رہے اور شعلہ نفس میں چمک، حرکت میں نشاط، اور انقلاب میں تیزگی پیدا ہوتی ہے یہی وہ نکتہ ہے جس کی وجہ سے اسلامی حکومت اللہ کو انسانی سفر کا مقصد قرار دیتی ہے اور صفات آبہ علم، قدرت، عدالت، رحمت، جود وکرم کو مقصد کے

واضح نشانات تصور کرتی ہے جس کے مجموعہ سے انسان کے سیر تکامل کا ایک مکمل مقصد سامنے آتا ہے۔ اور انسان جیسے جیسے اس ہدف کی طرف بڑھتا رہتا ہے اور اس سے قریب تر ہوتا رہتا ہے اس کے سامنے اور وسیع تر آفاق کے دروازے کھلتے رہتے ہیں اور اس کے عزم اور حوصلہ میں اضافہ ہوتا رہتا ہے انسان محدود ہے اور محدود لامحدود کو محیط نہیں ہو سکتا۔ نتیجہ یہ ہے کہ جیسے جیسے راستہ طے ہوتا جائے گا نئی ہدایتیں حاصل ہوتی جائیں گی اور راستہ خود مزید سعی کی دعوت دے گا۔ ارشاد قرآنی ہے" جو لوگ ہماری راہ میں جہاد کرتے ہیں ہم اُن کو مزید راستوں کی ہدایت کر دیتے ہیں۔ (عنکبوت ۶۹)

یہی وجہ ہے کہ اسلامی حکومت کا پروردہ انسان جس نے مطلع تاریخ امت ہی سے نئی تاریخ سازی کا کام شروع کیا تھا اس کے نفس کا شعلۂ عمل ابھی تک خاموش نہیں ہوا اور اس کا عمل برابر جاری ہے۔ اس کا ہدف حقیقی پروردگار ہے اور اس کا عدل مطلق برابر معرکۂ حیات کے لئے ایندھن فراہم کر رہا ہے۔ وہ ہر محاذ پر ظالمین سے بر سر پیکار ہے اور دنیا کے ہر طاغوت سے نبرد آزما ہے۔ نہ ایک قریہ، نہ ایک جزیرہ، نہ ایک قوم۔ بلکہ تمام کائنات ارض کے تمام ظالم اور تمام طاغوت سے۔

عقیدہ کی یہی طاقت تھی اور ایمان کا یہی شعلۂ جوالہ تھا جسے دیکھ کر بادشاہ کسریٰ اپنے جبروت سمیت لرز گیا جب اس نے عبادہ بن صامت سے تمسخرانہ انداز میں پوچھا کہ ان مسلمانوں کو کیا ہو گیا ہے کہ اتنی بڑی شہنشاہیت سے جنگ کے بارے میں سوچ رہے ہیں اور عبادہ نے جواب دیا کہ اسلامی لشکر کا مقصد

صرف مظلومین کو آزاد کرا دینا ہے۔ یعنی عدل مطلق کے تقاضے ختم ہونیوالے نہیں ہیں اور ہدف مطلق ہمیشہ تحریک اور حوصلہ افزائی کی قوت رکھتاہے۔

"اے پیغمبر کہدیجئے" کہ اگر سارے سمندر کلمات رب کے لئے سیاہی بن جائیں تو بھی سمندر کلمات سے پہلے ہی ختم ہو جائیں گے۔ چاہے دوسرے سمندر بھی اس کی مدد کو آجائیں۔ (کہف آیت ۱۰۹)

اسلامی حکومت کی عقائدی ترکیب جس کی بنیاد اللہ اور اس کے صفات و کمالات پر ایمان ہے اور جس نے اللہ کو انسان سیر تکامل کا ہدف اور تمدنی تحریکات کا مقصد قرار دیا ہے۔ تنہا ترکیب ہے جو تمدنی تحریک کو غیر تنا ہی حوصلہ اور غیر فانی قوت و طاقت دے سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے تمام نسبتی اور وقتی اہداف و مقاصد کی مخالفت کی ہے اور ایک مطلق ہدف کی طرف ذہنوں کو موڑ دیتا ہے کہ وقتی مقاصد اپنے حصول کے بعد حرکت کو روک دیں گے اور حوصلوں کو پست کر دیں گے۔ مردِ مسلمان جب ایک قریہ، ایک شہر یا ایک قوم میں ظلم کے خلاف جہاد کرتا ہے تو اس کی نظر میں یہ ظلم دیگر مظالم سے الگ نہیں ہوتا اور وہ صرف اسی ظلم کے ازالہ کو اپنے مقصدِ جہاد نہیں سمجھتا بلکہ اس کا ہدف مطلق ہوتا ہے اور وہ ہر ظلم کو مٹا دینا چاہتا ہے ورنہ ہدف نسبتی اور مقامی ہوتا تو اس کے معنیٰ یہ ہوتے کہ مسلمان اس قریہ کے ظلم سے ناراض ہے اور دوسرے قریہ کے ظلم سے راضی ہے اور یہ بات عقائدی مزاج کے خلاف ہے اور جب ظلم کو ظلم سمجھ کر مقابلہ کیا جائیگا تو اس میں افراد، اقوام اور علاقوں کا امتیاز نہ ہوگا اور عبادہ بن صامت کا وہ

دور پلٹ آئے گا جب انھوں نے جزیرۃ العرب کے ساتھیوں کو لے کر بلاد فارس کا ارادہ کیا تھا اور مطلب یہ تھا کہ وہاں کے غریب کاشتکاروں کو کسریٰ کے مظالم سے آزاد کروایا جائے۔ مقصد یہ ہے کہ اسلام محدود مقصد کا ساتھی نہیں ہے۔ وہ مطلق ہدف کا علمبردار ہے اور مطلق ہدف کی رفتار عمل کبھی سست نہیں ہو سکتی اور اس کا شعلۂ نفس کبھی بجھ نہیں سکتا

حکومت کے اسلامی عقائد کا اخلاقی پہلو

دنیا میں حق و عدل کا قیام اور معاشرہ کی صالح و صحتمند تعمیر ایسے مصائب و آلام کے برداشت کرنے کی متقاضی ہے جن کے لئے نفسیاتی محرک کا ہونا بیحد ضروری ہے اور وہ محرک مسئولیت کے شعور اور فریضہ کے احساس ہی سے پیدا ہو سکتا ہے جس کی راہ میں ہمیشہ موانع سامنے آتے رہتے ہیں اور رکاوٹیں کھڑی ہوتی رہتی ہیں اور سب سے بڑی رکاوٹ دنیا سے وابستگی اور اس سے تعلق خاطر ہے جو انسانی حرکت کو روک دیتا ہے اور اسے صالح تعمیر میں حصہ نہیں لینے دیتا۔ ایسی تعمیر میں حصہ لینا مشقتوں کا متقاضی ہے اور ایسا عظیم کام جد و جہد اور قربانی و مصائب چاہتا ہے۔ یہاں ایسی شجاعت درکار ہے جس کی بنا پر انسان اجتماعی فوائد کے لئے اپنی ذاتی محرومیت برداشت کر سکے اور یہ کام اس کے بس کا نہیں ہے جو دنیا سے وابستگی اختیار کرئے اور اس کی لذتوں اور راحتوں میں گم ہو جائے ایسا انسان چند روزہ لذتوں سے الگ نہیں ہو سکتا اور بڑے مقصد کے

لیئے چھوٹی خواہشات کو قربان نہیں کر سکتا۔

بڑے مقاصد کے لئے انسانی طاقت کو منظم کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے عقائد میں ایک ایسا اخلاقی پہلو پیدا کیا جائے جو اس کی اس انداز سے تربیت کرے کہ انسان دنیا کا آقا ہے غلام نہیں ہے۔ لذتوں کا مالک ہے مملوک نہیں ہے۔ اس کا رُخ وسیعتر زندگی کی طرف ہے محدود زندگی کی طرف نہیں ہے۔ اس کا ایمان یہ ہے کہ راہ خدا میں قربانی زندگی کا صرف نہیں ہے۔ زندگی کی تحصیل ہے۔ جس کی طرف قرآن حکیم نے حسب ذیل آیات میں اشارہ کیا ہے۔

"ایمان والو اموال و اولاد تمہیں یاد خدا سے غافل نہ بنا دیں کہ ایسا کرنے والا انسان خسارہ میں رہتا ہے" (منافقون ۹)

"یاد رکھو تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے وجہ آزمائش ہے۔" (انفال ۲۸)

مرسل اعظمؐ کا ارشاد ہے "جس شخص کی صبح اس عالم میں ہو کہ اس کی تمام تر فکر دنیا ہو اُس کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے (جامع السعادات ۲-۲۶)

"محبت دنیا ہر گناہ کی اصل ہے۔" (جامع السعادات نراقی ۲-۲۶)

دنیا سے تعلق اور اس سے وابستگی ہر انحراف کی اساس ہے اور اس کے تصورات و خیالات کو دل میں رکھنا خلافت الٰہیہ کی ذمہ داریوں سے علیحدگی ہے۔ دنیا کی لذتوں میں ڈوب جانے کا مطلب ذکر خدا سے غفلت اور یاد خدا سے جدائی ہے اور نتیجہ میں ان تمام اقدار و اذکار

سے انحراف ہے جو خدائے وحدہٗ لاشریک کے عقیدہ کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اور انسانی سیر زندگی کا مقصد بنکر اسے زمین سے بلند کر کے آسمانوں سے مربوط کر دیتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد مسلم سے اس دنیاوی تعلق اور وابستگی کو جدا کر لیا اور دنیا کو اس کی واقعی حیثیت دے دی۔ اس کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا کو مقصد قرار دینا عقیدہ سے متعارض ہے اور نتیجہ میں اس صالح تعمیر سے متصادم ہے جس کی طرف عقیدۂ آخرت دعوت دیتا ہے اور جس کا انجام دنیا کے دار تربیت ہونے کے بجائے ارضِ فساد ہوتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "زندگانی دنیا صرف لہو لعب، زینت باہمی منافرت، اور اموال و اولاد کی زیادتی کی فکر ہے اور بس

(الحدید آیت ۲۰)

"لوگوں کی نگاہ میں عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، گھوڑے چوپائے اور زراعت کی محبت آراستہ ہو گئی ہے حالانکہ یہ سب حیات دنیا کے سرمائے ہیں اور اللہ کے پاس بہترین انجام ہے۔ (آل عمران آیت ۱۴)

انسان دنیا کو آخرت کا راستہ اور اس کے خیرات کے حدود میں انسان کے حقیقی وجود کے ارتقار کا ذریعہ اور اللہ سے تعلق اور اس کی طرف مسلسل سیر کا وسیلہ بنالے تو یہی دنیا باہمی مقابلہ اور اموال پرستگان دنیا کیطرح اختلاف کا میدان بننے کے بجائے صالح تعمیر اور مسلسل ایجاد کا میدان بن جائے گی۔ ارشاد ہوا ہے

"جو کچھ اللہ نے دیا ہے اس سے دار آخرت کو طلب کرو۔ دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول جاؤ اور ویسے ہی احسان کرو جیسے اللہ نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے۔ خبردار روئے زمین پر فساد نہ کرنا۔ اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا" (سورہ قصص آیت ۷۷)

حدیث شریف میں وارد ہے "دنیا کو آخرت کے عوض بیچ ڈالو کہ دونوں مل جائیں گی اور خبردار آخرت کو دنیا کے عوض نہ بیچنا کہ دونوں کے خسارہ میں رہو گے (جامع السعادات ۲ ۳۳)

اسلام نے دنیا کے بارے میں اس "عبوری" تصور کو صرف ایک نظریہ بنا کر نہیں پیش کیا بلکہ اس بات کی کوشش کی ہے کہ نظریہ کو سلوک زندگی سے مربوط کرکے تصورات کو عالم واقع میں اتار دیا جائے اور دنیا کی تمام لذتوں کے ساتھ انھیں بنیادوں پر برتاؤ کیا جائے چنانچہ اس نے نظریہ کی عملی تعبیر و تفسیر اس انداز سے کی ہے کہ مرسل اعظم ارشاد فرماتے ہیں۔

"تم لوگوں کو ذوق کثرت نے اس قدر غافل بنا دیا ہے کہ ہر شخص مال کو میرا مال۔ میرا مال کہہ رہا ہے" حالانکہ تمہارا مال وہی ہے جس کو تم نے صدقہ میں دے کر بچا لیا ہے یا کھا کر فنا کر دیا ہے یا پہن کر میلا کر دیا ہے" (جامع السادات ۲ ۲۶)

دنیا کے بارے میں اسلامی نظریہ رکھنے والے اور نظریہ کو عملی سانچے میں ڈھالنے والے انسان کا فرض ہے کہ دنیا سے اور

اس کی حلال قوتوں سے اسی مقدار میں استفادہ کرے جو اس کے لئے محل ضرورت ہے۔ دنیا ضروریات کی تکمیل کے لئے ہے۔ ذخیرہ اندوزی اور مقابلہ کثرت کے لئے نہیں ہے۔ دنیا انسانی زندگی کا ہدف نہیں ہے اور اس کا کام اللہ کی راہ میں تیز قدم بڑھانے کے لئے طاقت وقوت فراہم کرنا ہے تو کھلی ہوئی بات ہے کہ انسان اسی مقدار میں استفادہ کرے گا جو اس کی ضرورت بھر ہو اور جس سے آخری مقصد کی تکمیل ہو سکے۔ ورنہ ضرورت سے زیادہ ذخیرہ کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان نے دنیا کو مقصد بنا لیا اور اس کی عبوری حیثیت ختم ہو گئی اور یہی جگہ ہے جہاں انسان اپنے صالح وصحتمند عمل کو بھول جاتا ہے۔ اور کافی دور جا کر اسے اپنے انحراف کے نتائج برداشت کرنا ہوتے ہیں۔ اور وہ ظلم وستم اور استبداد واستحصال کا شکار ہو جاتا ہے جیسا کہ مرسل اعظمؐ نے فرمایا ہے "جس نے دنیا سے ضرورت سے زیادہ لیا اس نے گویا موت کو بلا لیا۔ اور اسے اس کا شعور بھی نہیں ہے۔ (جامع السعادات ۲ ۲۰) یعنی ہر شخص اپنی ضرورت سے زیادہ جمع کرنا شروع کر دے گا تو نتیجہ میں ہر شخص کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اسلامی حکومت کے باشندوں کی یہی وہ صالح بنیاد ہے جس کی بنا پر انسان زمین کی فریب کاریوں اور معمولی لذتوں کی پریشانیوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے۔ جس کے بعد وہ تعمیر کی عظمت ترین ذمہ داریوں کو نہایت ہی کشادہ قلب، مطمئن نفس قوی دل وجگر اور

منفعت بخش حسلیے کے ساتھ انجام دے سکتا ہے۔ اور اس معاملہ میں خسارہ کا امکان نہیں ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: "اے صاحبان ایمان کیا میں تمہیں ایسی تجارت کی طرف رہنمائی کردوں جو تمہیں عذاب الیم سے نجات دلا دے تم اللہ اور رسولؐ پر ایمان لاؤ اور راہِ خدا میں نفس و مال کے ساتھ جہاد کرو۔ یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تمہارے پاس علم ہو۔" (صف آیت ۱۱)

اسلامی حکومت کے عقائد کا سیاسی پہلو

اسلامی حکومت میں عقائد کا سیاسی پہلو انسان کے خیر کی طاقتوں کے ارتقاء اور ان کے راہِ عمل میں استعمال میں بڑا نمایاں رول ادا کرتا ہے سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ پہلو استحصال و استبداد کے ان تمام روابط کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتا ہے جو جاہلی معاشرہ پر اثر انداز رہتے ہیں اور اسلام انسان کو انسان کی حکومت کے سیاسی، اقتصادی اور فکری ہر انداز سے آزاد کرتے ہوئے معاشرہ کو دو عظیم طاقتیں فراہم کر دیتا ہے۔ ایک اس استحصال کے مارے ہوئے انسان کی طاقت جسکی تمام تر صلاحیتیں شخصیتوں کی راہ میں ضائع ہو گئی تھیں اور انہیں اموال میں اضافہ اور زینتِ حیاتِ دنیا کی بہتات کی راہ میں صرف کیا جا رہا تھا اور اب استبداد کے خاتمہ کے بعد یہی صلاحیتیں پوری انسانی برادری کے لئے خیر کی طاقت بن جائیں گی۔

اور ایک خود اُس استبداد پسند انسان کی طاقت جو صرف استبداد کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی طاقت برباد کر رہا تھا اور اس سے انسانی برادری کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ رہا تھا اور اب یہی طاقت اپنی حقیقی منزل پر تعمیر و عمل کی طاقت بن جائے گی۔ آپ حالات کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا کہ کتنے ہی امکانات حکومتِ طاغوت کی راہ میں تباہ ہونے اور کتنے ہی صلاحیتیں استبداد و استحصال اور تحکم و جبریت کے استحکام کی نذر ہو گئیں جبکہ آزاد فضا میں یہی طاقتیں ارتقاء و استبداد کا بہترین سرمایہ فراہم کر سکتی تھیں۔

اسلام کی تاریخ اپنے عملی تجربہ میں اس مسئلہ کی بہترین مثال ہے جہاں اس نے انسان کی حریت و کرامت کو واپس دلا کر ارتقاء و ایجاد کی بہترین فضا قائم کر دی تھی اور ہر انسان نسل، نسب، وطن، مال کے قیود سے بے نیاز ہو کر کام کر رہا تھا، جاہلیت زدہ معاشرہ کے غلام یا غلام نما انسانیت کے با صلاحیت قائد بن گئے تھے اور زندگی کے فکری، سیاسی اور عسکری محاذوں پر اپنی بے پناہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ جبکہ اس کے پہلے یہ کچھ نہ تھا اور اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ یہاں افراد کے ارتقاء کو صرف صلاحیت کے معیار پہ پابند بنایا جاتا ہے اور یہی اسلامی حکومت کا مقصود ہے۔

امیر المومنین نے اپنے والی مصر سے ارشاد فرمایا "ہر شخص کے مرتبہ کو اس کی آزمائش کے ذریعہ پہچانو اور کسی شخص کے امتحان کا ذمہ دار دوسرے

کو نہ بناؤ اور نہ مکمل آزمائش کے بغیر فیصلہ کرو ۔ خبردار کسی شخص کی شخصیت اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ اس کے معمولی کارنامہ کو عظیم بنا دو اور کسی شخص کی معمولی حیثیت اس امر کا سبب نہ بن جائے کہ اس کی عظیم آزمائشوں کو معمولی بنا دو۔

اسلامی حکومت کا دوسرا سیاسی پہلو یہ ہے کہ اس حکومت میں حاکم اور محکوم دونوں کے حقیقی اور واقعی ہوتے ہیں اور ایک حاکم بھی ویسی ہی معمولی، عمومی اور عادی زندگی گزارتا ہے۔ جو محکومین کی زندگی ہوتی ہے۔ اس کا لباس مکان اور سلوک عام باشندوں جیسا ہوتا ہے یہاں مساوات کا صرف قانون کے الفاظ تک محدود نہیں ہوتی کہ اس کا کوئی واقعی اثر نہ ہو اور اس سے نہ انسانی زندگی بیدار ہو سکے اور نہ زندگی کے لئے کوئی صالح نمونہ فراہم ہو سکے۔

آج کے دور میں یہ بات انتہائی آسان ہے کہ طاغوت اور جبار حکام قوموں کے لئے قانون سازی میں دفتر کے دفتر سیاہ کر دیں اور ان میں حاکم و محکوم کے درمیان مساوات کے سوا کچھ نہ لکھا جائے لیکن واقعی زندگی میں اس کا دور دور پتہ نہ ہو اور اس کی کوئی واقعیت نہ ہو۔ صرف الفاظ کی آڑ میں حقائق کی پردہ پوشی کی جائے اور حاکم و محکوم کے درمیان طبقاتی امتیاز۔ حکام کی بالاتری، عوام کی پستی کو چھپا دیا جائے جبکہ اسلامی حکومت میں یہ ساری باتیں بوجہ دستور کے نقش جمیل نہیں ہوتیں جبکہ ان کی واقعی حیثیت ہوتی ہے اور انھیں زندگی

ہیں برتنا پڑتا ہے جیسی کہ زندہ مثال اسلام کی قدیم ترین تاریخ میں بھی ہے اور دور حاضر میں بھی۔ قدیم تاریخ میں مولائے کائنات کی زندگی ہے جہاں آپ ایک حاکم اسلامی ہونے کے باوجود اپنے حریف مدعی کے ساتھ قاضی کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اس سے پہلے جب ایک یہودی دربار عمر بن الخطاب میں آپ کی شکایت کرتا ہے تو آپ اس کے ساتھ دربار میں تشریف لے جاتے ہیں اور جب حاکم وقت عمر بن الخطاب یہودی کا نام لے کر اور آپ کو ابوالحسن کہہ کر خطاب کرتا ہے تو آپ کی تیوریوں پر بل آجاتے ہیں۔ عمر نے یہ تصور کیا کہ شاید ناگواری دربار میں حاضری کی بنا پر ہے آپ نے فرمایا کہ میری ناگواری صرف اس لئے ہے کہ تم نے فریقین کے درمیان انصاف نہیں کیا۔ مجھے کنیت سے پکارا جو طریقۂ تعظیم ہے اور اس یہودی کا نام لے کر پکارا جو طریقۂ توہین ہے۔ حاکم کو اس طرح کا امتیاز برتنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

اسلامی حکومت نے اس طرح حاکم و محکوم کے درمیان عدالت و انصاف کو مجسم کیا ہے اور خود حاکم کی شخصی زندگی کو بھی نمونۂ عمل اور ضعیف الحال انسانوں کے لئے تسکین روح کا سامان بنایا ہے۔ جب حاکم عام باشندوں کی طرح زندگی گزارے گا اور اس کی زندگی میں بلند و بالا قصر نہ تیز رفتار اور آرام دہ گاڑیاں، دسترخوانوں پر نعمتوں کا انبار اور گھر میں تحفوں اور جواہرات کا ہجوم نہ ہوگا

توضیف و ناتواں انسانوں کو خود بخود سکونِ روح حاصل ہو جائے گا۔ امیرالمومنین علی بن ابی طالب فرماتے ہیں۔

"میرا نفس کیسے مطمئن ہو جائے کہ مجھے امیرالمومنین کہا جائے اور میں مومنین کی زحمات زندگی میں ان کا ساتھ نہ دوں کیا ایسے حالات میں بھی کوئی سخت زندگی کے لئے نمونہ بن سکتا ہے؟"

اسلام نے اپنے حاکم کو یہی تعلیم دی ہے کہ خبردار حکومت کو لذات دنیا سے بہرہ ور ہونے یا دوسروں سے ممتاز ہونے کا ذریعہ نہ قرار دینا۔ یہ ایک مسئولیت، نیابت، خلافت اور کمزور و ناتواں انسانوں کے حالات میں شریک ہونے کا فریضہ ہے۔ اس کے بغیر حکومت اسلامی نہیں کہی جا سکتی۔

تاریخی تجربہ سے قطع نظر اگر دورِ حاضر کے حالات کا جائزہ لیا جائے اور اس مردِ مجاہدِ علوی (آیۃ اللہ الخمینی) کی زندگی کا جائزہ لیا جائے جس نے اپنی قوم کے جہاد کی قیادت کی ہے اور اسلام کے پرچم کو بلند کرنے کے لئے زحمتیں برداشت کی ہیں۔ یہاں تک کہ اللہ نے اسے فاتح قرار دیا اور اس کے ہاتھوں شہنشاہیت اپنے خزانوں سمیت تباہ و برباد ہو گئی اور سید علوی منظفر و منصور اپنے وطن واپس آیا۔ یہ منظر نظر آئے گا کہ اس نے اسی مکان میں قیام کیا جس مکان سے نکالا گیا تھا اور کوئی دوسرا مکان منتخب نہیں کیا تاکہ دنیا کو معلوم ہو جائے کہ علیؑ ایک فرد کا نام نہیں تھا جس کا انتقال ہو گیا۔ ایک اسلامی طریقۂ زندگی

کا نام ہے جو ہنوز باقی ہے اور ایک کردار ہے جو ہمیشہ باقی رہے گا۔

اسلامی حکومت میں حاکم کا یہ طرز زندگی یقیناً عوام میں بے پناہ حوصلے پیدا کر دیتا ہے اور انھیں ایک عظیم روحانی طاقت عنایت کر کے ہر فرد کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ حکومت کے ہر آرام میں حصہ لینا اپنی کرامت و شرافت و عزت و عظمت کی تعمیر میں حصہ لینے کے مترادف ہے۔

اسلامی حکومت کی سیاست کا نیسرا پہلو اس کے بین الاقوامی تعلقات میں جہاں استحصالی و استعمار اور ضعیفوں کا خون چوسنے کی فکر نہیں ہوتی اور مغربی تمدن کی طرح دوسروں پر حکومت کرنے یا ان سے مصالح کا تبادلہ کرنے کا معاملہ نہیں ہوتا بلکہ سیدھے سیدھے حق و عدالت کی بنیاد پر کمزوروں کی مدد کی جاتی ہے اور حق و عدل سے امت کے ضمیر کو معمور کر دیا جاتا ہے۔ یہاں حق و انصاف کے وہ کھوکھلے الفاظ نہیں ہوتے جن کا مقصد اپنے مقاصد و مصالح کے لئے استعمار و استحصال کے اسباب فراہم کرنا ہو۔ جیسا کہ اقوام متحدہ کی سیاست کا ما حصل ہوتا ہے اور تمام بین الاقوامی اداروں کا طریقہ کار ہے کہ جب تک کوئی حقیقت بڑی حکومتوں کی مصلحتوں سے نہ ٹکرائے اقوام متحدہ کے ایوانوں میں حق و انصاف کی آوازیں گونجتی ہیں اور جب کوئی حق بڑی طاقتوں کی مصلحتوں کے خلاف ہو جاتا ہے تو حق میں اتنی طاقت نہیں رہ جاتی کہ وہ اقوام متحدہ کی عمارت کی دیواروں کو پار کر سکے۔

اسلامی تاریخ کے تجربات میں ایسے بیشمار واقعات پائے جاتے ہیں جہاں حق وانصاف کی بہترین مثالیں موجود ہیں۔ حد یہ ہے کہ تاریخ کے جس دور میں اسلامی تعلقات کا وہ زور نہیں رہ گیا تھا اور ظالمین نے اسلام کی تعلیمات کو محو کر دیا تھا۔ اس دور میں بھی عدل وانصاف کے بعض آثار نظر آجاتے ہیں۔

عمر بن عبدالعزیز کے دورِ حکومت میں قتیبہ کی قیادت میں مسلمانوں کا ایک لشکر سمرقند کی طرف روانہ کیا گیا اور وہاں پہنچکر ان لوگوں سے ایک معاہدہ کر لیا اور جب لوگ معاہدہ سے مطمئن ہو گئے تو شہر میں داخل ہو کر معاہدہ کو نظر انداز کر دیا۔ لوگوں نے حاکم تک اس کی شکایت پہنچائی حاکم نے قوم اور قائد دونوں کو قاضی کے سامنے پیش ہونے کا حکم دیا۔ قاضی نے فیصلہ کیا کہ لشکر کو فوراً واپس ہو جانا چاہیئے۔ ظاہر ہیں کسی حکومت یا عالمی ادارے کی طرف اپنے ہی لشکر کے خلاف فیصلہ کر کے اسے واپس بلا لینے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ صرف اسلام کی بین الاقوامی سیاست تھی۔ جس میں حق وانصاف کا عنصر ہمیشہ نمایاں اور غالب رہا کرتا ہے ارشاد ہوتا ہے

"ایمان والو اللہ کے لئے عدالت کے ساتھ گواہ بن کر قیام کرو اور خبردار کسی قوم کی عداوت تمہیں عدالت کے راستے سے ہٹا نہ دے۔ انصاف کرو یہی تقوی سے قریب تر ہے اور تقوی اختیار کرو کہ اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے (مائدہ آیت ۲)

اسلامی حکومت کا اس روح کے ساتھ بین الاقوامی سطح پر معاملات کرنا انسانی ضمیر کو بیدار کرنے اور اسے حق و انصاف کے تقاضوں سے باخبر کرکے عدالت کی راہ میں ہمسفر بنا دینے کے لئے بیحد مفید ہے اور عالمی سطح پر اس کا واقعی اثر بھی ہے۔

۲۔ آج کی دنیا اور مرد مسلم کا مزاج۔

اسلامی حکومت جس طرح اپنے مخصوص عقائدی مزاج کی بنا پر بے پناہ قدرت و قوت کی حامل ہے اسی طرح اس کی بعض عظیم طاقتوں کا تعلق عالم اسلام کے انسان یعنی خود مرد مسلمان کے عقائدی، نفسیاتی اور تاریخی مزاج سے بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی اجتماعی نظام فضا اور خلا میں کام نہیں کرتا۔ اس کے کارہائے نمایاں کا تعلق کائنات بشر اور اس کے باہمی تعلقات سے ہوتا ہے۔ اور اس اعتبار سے اس کی کامیابی اور اس میں معاشرہ کی صلاحیتوں کو جمع کرنے کی قوت اور افراد کی نیک طاقتوں کو ابھارنے کی صلاحیت کا حساب بھی انھیں افراد کے نفسیاتی اور تاریخی مزاج سے ہم آہنگی کے اعتبار سے ہوگا۔ اور جو قانون اپنے افراد کے مزاج سے جس قدر زیادہ تناسب اور ہم آہنگ ہوگا اتنی ہی زیادہ کامیابی سے ہمکنار ہوگا۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہر اجتماعی نظام اور تمدنی فکر کا فرض ہے کہ وہ سماج کے افراد کی نفسیاتی اور تاریخی تشکیل کرے اور ان کے تمام افکار و احساسات کو مخصوص سانچوں میں ڈھال دے

اس لئے کہ یہ بات اسلامی معاشرہ کے اعتبار سے تو ممکن بھی نہیں ہے
یہ معاشرہ پہلے ہی سے پستی، زبوں حالی، انتشار اور ضعیفِ نفس کا
فریادی ہے اب اگر اس معاشرہ کو نظام کے سانچے میں ڈھالنے
کی کوشش کی گئی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی بربادی اور غلامی
کو اور مستحکم کر دیا جائے گا۔

مذکورہ بالا قانون کا مقصد یہ ہے کہ کوئی بھی تمدنی نظام
اگر پست معاشروں کو بلند کرنا چاہتا ہے اور امت کی ترقی کے لئے
اس کی طاقتوں کو منظم کرکے۔ جملہ امکانات کو زبوں حالی کے خلاف
جہاد میں صرف کرنا چاہتا ہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنا
خاکہ مرتب کرتے وقت امت کے احساسات، نفسیات اور اس
کی تاریخی اور عقائدی ترکیب کا خیال رکھے۔

تمدنی ارتقار کا کسی اجتماعی نظام کا محتاج ہونا صرف ایک
مفروضہ نہیں ہے کہ ہر ارتقار کے لئے ایک اجتماعی اور سیاسی
نظام ہونا چاہیئے اور اس کا تجریدی تصور ممکن نہیں ہے —
بلکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ تعمیری کام یعنی امت کے ارتقار اور اس
کی قوتوں کو پست حالی کے خلاف ابھارنے کی کوشش اس وقت
تک کامیاب ہو ہی نہیں سکتی جب تک کہ اس کے لئے کوئی لائحہ
عمل نہ ہو جو اپنے اندر امت کو جذب کر سکے اور پھر اسی بنیاد پر
اس کے ساتھ مل کر کام کر سکے۔ امت کا متحرک ہونا تمدنی عمل کی

کامیابی کے لئے شرط اولین ہے۔ امت کے متحرک ہونے کا مطلب، اس کے ارتقائی ارادہ اور جملہ داخلی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا ہے اور اس کے بغیر کوئی نظام یا اصول حقائق کو متغیر نہیں کر سکتا۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے حالات کو تبدیل نہ کرے۔ (رعد ۱۱)

اگر ہم امت کی تعمیر جدید کے لئے کوئی لائحہ عمل مرتب کر کے زبوں حالی کا استیصال کرنا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ اس حقیقت کو بنیاد قرار دیں اور اس کی روشنی میں تمدنی نظام مرتب کریں تاکہ وہ نظام امت کو حرکت میں لا سکے اور زبوں حالی کے خلاف جہاد میں اس کی طاقتوں اور صلاحیتوں کو منظم کر سکے۔

عالم اسلام کے انسان یعنی مرد مسلمان کے لئے دنیا کی کوئی حکومت اسلامی حکومت کے علاوہ ایسا نظام نہیں پیش کر سکتی جو اس کے تعمیری کام کی بنیاد بن سکے اور اس کے اجتماعی نظام کے لئے پلیٹ فارم کا کام دے سکے۔ جس کے اسباب ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں اور انھیں سے اندازہ ہوگا کہ اسلامی حکومت کس قدر تحریک اور تعمیر کی قوت رکھتی ہے اور کس طرح انسانی طاقتوں کو بروئے کار لا سکتی ہے۔

ایمان بالاسلام

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عالم اسلام کا ہر باشندہ اپنے

اسلام کو ایک دین اور خاتم الانبیاء پر نازل ہونے والا ایک الٰہی پیغام سمجھتا ہے جس پر عمل کرنے والے کے لیے جنت اور اس سے رد گردانی کرنے والے کے لیے جہنم ہے۔

یہ عقیدہ اگرچہ مسلمانوں کے درمیان صرف ایک بے معنی عقیدہ ہے اور انحراف کے مختلف ادوار سے گزرتے ہوئے اپنی تابش و طاقت کو کھو چکا ہے اور عالم اسلام میں استعمار اور استعماریوں کی دخل اندازی سے اس کی انقلابی طاقتیں مفقود ہو چکی ہیں اور اسی لیے اب مسلمان بھی وہ امت اسلامیہ نہیں رہ گئے جنہیں امتِ وسطِ بنا کر عالم کی شہادت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور جو عالمِ بشریت کی ہدایت کے لیے بہترین امت تھے۔ امت صرف افراد کے مجموعے کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ مجموعہ اپنی مسئولیت اور الٰہی ذمہ داریوں کا احساس کرے تاکہ اندر سے وہ امت بن جائے جس کا مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہو اور اس طرح اس کا عقیدہ ایک تعمیری عمل بن جائے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"تم بہترین امت تھے جسے لوگوں کے لیے نکالا گیا تھا کہ تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دو۔ برائیوں سے روکو اور اللہ پر ایمان رکھو" ۔ (آل عمران آیت ۱۱۰)

آیت کریمہ میں امر و نہی کے بعد ایمان کو خیر امت کے خصوصیات میں شمار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ ایمان فقط

قلب کی گہرائیوں میں دفنایا ہوا حنوط کردہ جنازہ نہیں ہے بلکہ پہلو میں بھڑکنے والا ایک شعلہ اور اپنی تنویر سے عالم کو منور کرنے والا ایک چراغ ہے جس کا حامل انسان خارجی طور پر خود بخود مسئول بن جاتا ہے اور قرآن حکیم اعلان کرتا ہے

"اسی طرح ہم نے تم کو امتِ وسط بنایا ہے کہ تم تمام لوگوں پر ہمارے گواہ رہو"۔ (بقرہ ۱۴۳)

آیات بالا کا مقصود یہ ہے کہ جب تک مسلمان خیر امت اور امتِ وسط کی منزل تک نہ پہنچ جائے امتِ اسلامیہ کے کہے جانے کے قابل نہیں ہے اور جب تک عقیدہ زندگی کے اعمال کی بنیاد نہ بنجائے زندگی میں اسلامی پیغام کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

لیکن ان تمام خامیوں، کمزوریوں، سرد مہریوں کے باوجود آج بھی اسلام کم از کم ایک منفی اثر ضرور رکھتا ہے۔ امت اسلامیہ کسی ایسے تمدنی نظام یا اجتماعی ضابطہ کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہے جس کے افکار اسلام سے ہم آہنگ نہ ہوں اور وہ کم از کم نظریاتی اعتبار سے ایسے ہر نظام کو غلط اور ناجائز سمجھتی ہے یہ ایمان عملی شکل اختیار کرے یا نہ کرے ایک منفی مؤقف بہر حال تشکیل دے دیتا ہے جس کے بعد کسی تہذیب اور تمدن کا عمل کامیاب نہیں ہو سکتا اور نہ وہ قیادت کا فرض انجام دے سکتی ہے۔ اور اگر اتفاقاً کسی نظام کی قیادت کا موقع مل بھی گیا تو تھوڑے ہی

دنوں کے بعد یہ تناقص اس قدر پریشان کرتا ہے کہ حکومت جبر و تشدد پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور اسے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ جبر و تشدد کے بغیر امت کی قوتوں کو جمع کرنا اور ان سے استفادہ کرنا ممکن نہیں ہے اور جیسے جیسے یہ تشدد بڑھتا جاتا ہے امت میں منفی رجحانات اور ترقی کرتے جاتے ہیں اور اس طرح اس کی طاقتوں کا جز اعظم صرف جبر و تشدد کی نذر ہو جاتا ہے جہاں ایک طرف لوگوں کو قانع کرنے کی فکر ہوتی ہے اور دوسری طرف خاموش رد عمل کے مقابلہ میں طاقت و قوت صرف کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے برخلاف اگر امت کے سامنے اسلامی حکومت اور اسلامی نظام کا فارمولا پیش کر دیا جائے جس کی قیادت اس امت کے ہاتھ میں ہو جو امر بالمعروف، نہی عن المنکر کی خوگر اور ایمان باللہ کی پیکر ہو تو نہایت ہی مختصر سی مدت میں یہ "معنوی قسم" کا عقیدہ منفی حیثیت سے نکل کر مثبت حیثیت اختیار کر سکتا ہے اور جدید تمدنی تعمیر میں لگایا جا سکتا ہے۔ جب لوگوں کو یہ اندازہ ہو گا کہ یہ عمل ہمارے عقیدہ کی ایک تعبیر و تجسیم ہے اور اس طرح ہمارے عقیدہ کو فروغ حاصل ہو رہا ہے تو اگر بہت سے لوگ اس قربانی اور اذیت کے لیے ابتدائی طور پر تیار نہ بھی ہوئے تو جیسے ہی نظام بر سر کار آجائے گا اور لوگ یہ دیکھیں گے کہ اس نظام میں ان کی تمام امیدیں اور اپنے تمام عقائد

واذکار مجسم ہیں تو خود بخود اس سے منسلک ہو جائیں گے اور اس طرح خالی عقیدہ ایک روشن تابناک اور زندہ عقیدہ بن جائے گا جس میں حیات بہم ہو گی اور حرکت بھی اور نشاط عمل بھی اور امت بغیر کسی جبر و تشدد کے خالص ایمان و مخصوص اخلاص کی بنا پر عظیم تعمیری کام میں لگ جائے گی اور پھر معاشرہ انسانی اور اسلامی معاشرہ ہو جائے گا۔

مستقبل کے اس متوقع انقلاب و تغیر کی وضاحت کے لیے زندگی کی بعض چھوٹی چھوٹی مثالیں ہی کافی ہیں کہ آج جب کہ اسلام صرف ایک خیالی عقیدہ ہے اس میں اتنی قوت پائی جاتی ہے کہ وہ کروڑوں انسانوں کو مطمئن کر کے ان میں مالی ٹیکس زکوٰۃ وغیرہ کو بہ طیب خاطر ادا کرنے پر آمادہ کر لیتا ہے جبکہ حکومتیں مختلف وسائل و ذرائع استعمال کرنے کے بعد بھی اپنے محصولات وصول نہیں کر پاتیں۔ تو یہیں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب یہی محصولات بنام اسلام وصول کیے جائیں گے تو امت اسلامی محصولات کو کس آسانی و سہولت اور ایمان کے ساتھ ادا کردے گی۔ اور سماجی ارتقا کس قدر آسان ہو جائے گا۔ بلکہ اسلام نے تو اس نئے رخ "عقیدہ کے سایہ میں بارہا یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس میں اب بھی طاقت پائی جاتی ہے کہ وہ جہاد کے نام پر اسلام کے پرچم تلے بیشمار مجاہدین کو صرف عقیدہ کی آواز پر لبیک کہنے کے لیے

جمع کر سکتا ہے جبکہ دنیا کی دوسری حکومتیں اتنے سپاہی اس وقت تک فراہم نہیں کر سکتیں جب تک نظم و ضبط اور اقتدار کی جملہ صلاحیتیں صرف نہ کر دی جائیں۔ آپ سوچیں کہ ایسا اسلام اگر سماج کی قیادت کرنے لگے اور اسے امت کی زمام حکومت دے دی جائے تو وہ کتنا بڑا انقلاب برپا کر سکتا ہے اور کتنی بڑی جہادی طاقت فراہم کر سکتا ہے۔

اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو مسلمان کی زندگی کا انتشار اور افتراق ختم ہو جائے اور اس کے وجود پر مختلف متضاد حکومتوں کی وجہ سے طاری ہونے والی پارہ پارہ کر دینے والی کیفیت فنا ہو جائے۔ مسلمان جب مختلف نظاموں کے زیر سایہ زندگی گزارتا ہے تو اکثر اوقات میں اپنے کو متضاد اعمال انجام دینے پر مجبور پاتا ہے وہ مسجد میں خدا کے سامنے ان باتوں کا انکار کرتا ہے جنہیں دکان اور دفتر میں اختیار کرتا ہے اور زندگی کے کاروبار میں ان باتوں کو خیر باد کہہ دیتا ہے جن کی مسجد میں تقدیس کرتا ہے اور ان کا رب العالمین سے معاہدہ کرتا ہے اور ان مختلف حکومتوں کے پاس کوئی حل نہیں پاتا ہے سوائے اس کے کہ مسجد سے کنارہ کش ہو جائے تو زندگی میں ایک روحانی خلا سے دوچار ہو کر اپنے وجود اور پھر اپنے معاشرے کو تباہ کر دے یا زندگی کے دوسرے معاملات سے کنارہ کش ہو جائے۔ اور صرف ایک منفی طاقت بن کر رہ جائے تو

اس طرح سماج اپنے پاکیزہ ترین افراد اور مخلص ترین اولاد
کی خدمات سے محروم ہو جائیں۔ لیکن اسلامی حکومت کے زیر سایہ
ایسی کوئی پریشانی نہیں ہے۔ یہاں ارض و سما میں اتحاد اور مسجد
و دفتر میں اتفاق پایا جاتا ہے۔ یہاں مسجد کی دعا حقائق سے فرار
نہیں ہے بلکہ اسی روح کا تجربہ ہے۔ جس کے بعد انسان کی زندگی
میں حقیقی وحدت
اور واقعی اتحاد و اتفاق پیدا
ہو جاتا ہے اور وہ اخلاص عمل کے ساتھ مصائب پر صبر کرنے کا
جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔

ب، تجربات کی وضاحت اور اس سے جذباتی تعلق۔

انسانی مزاج ہے کہ وہ کسی نئے نظام کے لئے بذل و عطا
کا مظاہرہ اسی وقت کرتا ہے جب اس کی وہ نمایاں مثال اور واقعی
تصویر دیکھ لیتا ہے جس کے لئے اسے دعوت دی جا رہی ہے اور
جس کی تشکیل کا اسے حصہ دار بنایا گیا ہے۔ باہر سے درآمد
ہونے والی تحریکوں کی کمزوری یہی ہے کہ اس کے نمونے ماضی
کے ہوں یا حال کے اسلامی حدود سے باہر کے ہیں اور انھیں
مرد مسلم کے سامنے اپنے صحیح خاکہ کو پیش کرنے کے لئے سخت
زحمتوں کا سامنا ہے۔ وہ نمونے مسلمان کی زندگی سے اجنبی
اور اس کے لئے پریشان کن ہے۔ ڈیموکریسی ہو یا اشتراکیت۔

مادیت ہو یا اشتمالیت سب کا المیہ یہی ہے کہ ان کا تجربہ اسلامی حدود سے باہر ہوا ہے اور انھوں نے مختلف شکلیں اور صورتیں اختیار کی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مردِ مسلمان کے سامنے ان کی کوئی واضح صورت نہیں ہے۔ وہ یہی دیکھتا ہے کہ جن حکومتوں کے ڈیموکریسی کا نعرہ زیادہ بلند ہے اور یہ لفظ بطور جزو حکومت استعمال ہوتا ہے ان حکومتوں میں ڈکٹیٹر شپ زیادہ ہے۔ اور اور جن حکومتوں میں اشتراکیت کا چرچا زیادہ ہے ان میں امتیازات کی ایسی بہتات ہے کہ جن لوگوں کو ایک دن بے پناہ اہمیت دی جاتی ہے انہیں دوسرے دن ذلیل کر دیا جاتا ہے۔ جو اسٹالین ایک دن قوم کا خدا بنتا ہے وہی دوسرے دن مرتے ہی جنت سے نکال دیا جاتا ہے اور شرافت کے تمام عنوان اس سے چھین لئے جاتے ہیں۔ ماؤ۔ ایک چوتھائی صدی کے اندر "شخصیتِ مطلقہ" کے دائرہ سے نکل کر تنقیدی شخصیت بنجاتا ہے اس طرح مفاہیم و شعارات کے تجربہ میں تنوع اور تجربات اور تجربہ کنندگان کی قدر و قیمت کا اختلاف مسلمان کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہوتا کہ وہ نظام کی صحیح تصویر بنا سکے۔ اور پھر اس کی تشکیل میں خون، پسینہ اور زندگی کی قربانی دے سکے۔ اس کے خلاف اسلامی حکومت مردِ مسلمان کو ایک واضح مثال پیش کرتی ہے جو اس کے لئے سورج سے زیادہ روشن ہے اور جس کو اپنے نفس کے قریب تر، اپنے احساسات سے ہم آہنگ

اور اپنی تاریخ کے بہترین مراحل سے مستعار پاتا ہے وہ کون سا مسلمان ہے جو دورِ پیغمبرؐ کے اسلامی اقتدار کا حال نہیں جانتا۔ کون سا مسلمان ہے جسے مولائے کائنات کا نظامِ حکومت نہیں معلوم ہو اور اس نے نبیؐ و علیؑ کے درمیانی اقتدار کا نقشہ نہیں دیکھا ہے۔ وہ کون ہے جسے ان مقدس ادوار کی عظمت و شرافت متحرک نہیں بنا سکتی۔ اور وہ کون ہے جو اس احساس سے مسرور نہیں ہو جاتا کہ اسلامی حکومت کے قیام کے ساتھ ہی وہ دور پھر واپس آ جائے گا اور گویا نبیؐ و علیؑ کے ادوار کی طرح دنیا عدل و انصاف اور نور و ضیا سے معمور ہو جائے گی۔

اسلامی حکومت مسلمان کو کسی تاریکی میں نہیں لے جاتی اور نہ ان دور و دراز نقاط کی طرف اشارہ کرتی ہے جس کا اندازہ کرنا اور جن کا صحیح معنوں میں مشاہدہ کرنا ایک عام مسلمان کے بس کی بات نہیں ہے۔ نہ ایسے متضاد مجموعے میں پھینک دیتی ہے جہاں نعرہ ایک ہوتا ہے اور نظریات مختلف اور کسی نقطہ پر اتحاد نہیں ہوتا۔ اسلامی حکومت انسان کو روشنی میں لے جاتی ہے اور اس بلندی کی طرف اشارہ کرتی ہے جسے ہر مسلمان نے دیکھا ہے اور جس کی واضح شکل ہر مسلمان کے ذہن میں محفوظ ہے اور اس طرح مردِ مسلمان کو اسلامی تمدن کے حصار میں راستہ سے مطمئن مقصد پہ معتمد اور راہ و چاہ کے امتیازات کا حامل بنا کر راستہ طے کراتی ہے

نمونہ جس قدر واضح ہوگا معیار اتنا ہی مستحکم ہوگا اور اسی کی روشنی میں استقامت اور انحراف کا فیصلہ آسان ہوگا اور ان سب کے نتیجہ میں عظیم تعمیری کام کی دعوت پر لبیک کہنے کے لئے ذہنی فضا سازگار اور ہموار ہوگی۔ وہ ایک راستہ پر مشین کے پرزہ کی طرح نہیں چلے گا بلکہ ایک صاحب فکر و نظر انسان کی طرح آثار سفر کا شعور اور نمونہ عمل کے ادراک کے ساتھ قدم آگے بڑھائے گا۔

ج۔ تجربہ کی پاکیزگی اور استعمار سے عدم ارتباط

عالم اسلام کے انسان نے استعمار کے ہاتھوں اس قدر مکر اور حیلسازی کا تجربہ کیا ہے کہ اب اس کے لئے یہ تجربہ ایک نہایت ہی تلخ شعور بن گیا ہے جس کی وجہ سے وہ استعمار کی طرف سے ہر وقت مشکوک رہتا ہے اور اس کے ذہن میں اس بکے رُکے ہوئے نظاموں کی طرف سے ایک بیزاری کا سا جذبہ رہتا ہے اور وہ ایک عجیب حساسیت کا شکار ہے جس کی وجہ سے استعمار کے احکام غیر استعماری اور صالح بھی ہوں تو مسلمان انھیں تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے اور نہ ان نظاموں کے نام پر اسکی طاقتوں کو ابھار کر اس سے تعمیر نو کا کام لیا جا سکتا ہے اور یہ سب اس وقت سے ہوا ہے جب سے مغرب کے سفید فام انسانوں نے ہماری زمینوں پر قدم جما کر اسے اپنے افکار اور نظام ہائے

حیات اور اسلحوں سے پامال کر رہا ہے، عالم اسلام کے لئے ضروری ہے کہ اسے ان نفسیاتی حالات کی بنا پر ایک ایسا نظام دیا جائے جس کا استعمار اور استعماری ممالک سے کوئی تعلق نہ ہو تاکہ اس حساسیت اور بیزاری کا بھی علاج کیا جا سکے جو استعمار کے خلاف ہر مرد مسلم کے دل میں پائی جاتی ہے۔

یہی وہ واضح حقیقت تھی جس نے عالم اسلام میں مختلف سیاسی جماعتوں کو جنم دیا۔ جن کا کام قومیت کو اسلامی فلسفہ اور اسلامی تمدن کی بنیاد قرار دینے کا تھا اور انھوں نے اس راہ میں بے پناہ زحمتیں برداشت کی ہیں کہ قومیت کی رگ کو پھڑکا دیا جائے اور استعمار کے خلاف ایسے انقلابی نعرے دیئے جائیں جو ذہن کو کسی شکل میں استعمار کی طرف نہ جانے دیں اور غیر ملکی انسان سے بیزار رہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ قومیت ایک نسلی اور لسانی رابطہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ وہ نہ فلسفہ ہے کہ اس کے اصول ہوں اور نہ عقیدہ ہے کہ اس کی بنیادیں ہوں۔ وہ صرف تمام دوسرے فلسفوں۔ اجتماعی مذاہب اور عقائدی و دینی تصورات سے بیگانگی کا جذبہ ہے اور اسی لئے اسے خود کائنات حیات کے بارے میں ایک نظریہ کی ضرورت ہے اور اپنی تہذیب اپنے تمدن اور اپنی معاشرت کی تشکیل میں ایک مخصوص فلسفہ درکار ہے جس کی بنیاد پر اسے با مقصد بنایا جا سکے۔

نہیں ہے۔ وہاں "غلہ کی کمی"۔ "رسد و طلب"۔ "اجرت کا آہنی قانون"
جیسے مسائل نہیں پائے جاتے۔ قیمت کا تجزیہ نہیں کیا گیا۔ یہ فیصلہ کردیا کہ
اسلام میں اقتصادیات کا وجود نہیں ہے اور یہ دلیل قائم کی کہ ایسے اہم
مسائل کے نہ ہوتے ہوئے اقتصادیات کا اعتراف کیونکر کیا جا سکتا ہے۔
حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ یہ مسائل آخری چار صدیوں کے اندر کے مسائل
ہیں اور اسلام میں ان مسائل کے اٹھانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔
وہ ایک اقتصادی نظام ہے جس میں عدالت کے تقاضوں کے مطابق
زندگی کو منظم کیا جاتا ہے۔ ہمارا دعویٰ علم الاقتصاد کے وجود سے متعلق
نہیں ہے کہ اس میں آدم اسمتھ جیسی بحثیں تلاش کی جائیں۔ ہمارا دعویٰ
اقتصادی نظام سے متعلق ہے جس کا وجود ایک امر معقول اور شئے ممکن ہے
اس سے زیادہ تفصیلات کا موقع نہیں ہے اور نہ ہم اس مقام پر قرآن
وسنت سے اقتصادی نظام کے وجود پر دلائل فراہم کرنے کے موقف
میں ہیں۔ یہ کام ہم نے آئندہ رسالوں کے لئے چھوڑ دیا ہے۔ اس رسالہ
میں تو صرف اقتصادی نظام کے وجود کا دعویٰ کرنا تھا اور اس غلط فہمی
کا ازالہ کرنا مقصود تھا کہ علم اور مذہب کی راہیں الگ الگ ہیں اور ایک کے
مباحث کا نہ ہونا دوسرے کے مسائل کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔
ویسے خود شریعت اسلام کی ساخت اور اس کا مزاج بھی اسلامی اقتصادیات
کے وجود کی بہترین دلیل ہے جس سے کسی وقت بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

.....

شریعت کی ہمہ گیری

شریعت اسلام کا زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہونا اور جملہ مسائل حیات کے لئے جامع وہمہ گیر ہونا ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کے اثبات کے لئے تمام روایات کا جائزہ لینا پڑے اور جملہ احکام کے تفاصیل پر غور کرنا پڑے، یہ بات خود شریعت کے مزاج کے اندر ہے اور روایات میں جہاں جہاں شریعت کے مزاج کا ذکر کیا گیا ہے اس میں اس ہمہ گیری کا ذکر موجود ہے۔ مثال کے طور پر چند روایات ملاحظہ ہوں۔

۱۔ ابو بصیر بیان کرتے ہیں کہ امام جعفر صادقؑ نے شریعت اسلام کی جامعیت وہمہ گیری اور ائمہ اہل بیتؑ کے علوم کی وسعت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ "اس شریعت میں جو حلال و حرام اور ہر وہ شے جس کا انسان محتاج ہو سکتا ہے موجود ہے۔ یہاں تک کہ خراش لگ جانے تک کا قانون موجود ہے۔"

یہ کہہ کر آپ نے ابو بصیر کے جسم کو اپنے ہاتھوں سے دباتے ہوئے فرمایا کہ اس کا تاوان بھی شریعت میں موجود ہے اور جسم پر زور دینے سے پہلے ابو بصیر سے اجازت لی کہ شرعاً ایسا اقدام صحیح نہیں ہے۔ ابو بصیر نے بھی عرض کیا کہ میں آپ کا غلام ہوں۔ آپ کو ہر اختیار حاصل ہے۔

۲۔ دوسرے مقام پر امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ شریعت میں ہر وہ شئے موجود ہے جس کے لوگ محتاج ہو سکتے ہیں۔ دنیا کا

کوئی مسئلہ ایسا نہیں ہے جس کا حل اسلام میں نہ ہو۔ یہاں تک کہ خراش کے تاوان کا بھی ذکر موجود ہے۔

۳۔ نہج البلاغہ میں رسول اکرم اور قرآن حکیم کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں "اللہ نے رسول اکرم کو اس وقت بھیجا جب رسولوں کا سلسلہ رکا ہوا تھا اور امتیں خواب غفلت میں تھیں۔ محکم پیمانے توڑے جا رہے تھے آپ نے آکر وہ کتاب پیش کی جو سابق کتابوں کی مصدق تھی اور قابل اقتدار نور کی حیثیت رکھتی تھی۔ یہی کتاب قرآن ہے اس کو دعوت سخن دو۔ اگرچہ یہ تم سے کلام نہ کرے گا لیکن میں تمہیں خبر دیتا ہوں کہ اس میں مستقبل کے مسائل اور ماضی کے واقعات سب موجود ہیں۔ یہ تمہارے امراض کی دوا اور تمہارے معاشرہ کی تنظیم کا وسیلہ ہے۔

ان بیانات سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی شریعت ایک جامع اور ہمہ گیر شریعت ہے اور اس میں چھوٹے سے چھوٹے مسائل یہاں تک کہ خراش کے تاوان کا ذکر موجود ہے۔ اس کے بعد کیا تصور ہو سکتا ہے کہ خراش کے مسئلہ کا حل موجود ہو اور اقتصادی مشکلات کا حل نہ ہو۔ یہ کیسی جامعیت ہے کہ خراش کا تاوان طے کر دیا جائے اور زندگی کے اہم ترین پہلو کو نظر انداز کر دیا جائے اور اس کی کوئی تنظیم نہ کی جائے۔ جسم پر خراش لگ جائے تو مجروح کا حق معین کر دیا جائے اور پیدا ہونے والی ثروت میں کسی کا حق معین نہ کیا جائے۔ مزدور اور سرمایہ دار کے حقوق کا تعین نہ کیا جائے۔

یہ کوئی عقل میں آنے والی بات ہے کہ شریعت خراش لگ جانے پر آپ کا حق مقرر کر دے اور زمین کے آباد کرنے، کان کے برآمد کرنے، چشمہ کے نکالنے، جنگلات پر قبضہ کرنے میں آپ کے حقوق کا تعین نہ کرے۔ کیا اس کا نام جامعیت ہے اور اس کو ہمہ گیری کہتے ہیں

شریعتِ اسلام اور مصادرِ مخصوص شریعت پر ایمان رکھنے والا شخص اس حقیقت کو باور کر سکتا ہے کہ اسلام نے جہد مشکلاتِ حیات میں کس طرح معاشی مشکلات کا بھی حل پیش کیا ہے اور اس کی تنظیم کا انتظام کیا ہے بلکہ یہیں سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی اقتصادیات پر یہ کہکر اعتراض کرنا کہ اسلام افراد کے سلوک کا تعین کرتا ہے۔ اجتماع اور معاشرہ کا نہیں اور پھر اس بنیاد پر اسلامی معاشیات کا انکار کرنا ایک انتہائی غفلت کا کام ہے۔ گذشتہ روایات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اسلام کے دائرۂ عمل میں کائنات کی ہر شئے داخل ہے اس میں اجتماع اور افراد کا کوئی فرق نہیں ہے۔ اور پھر یہ مذکورہ دعویٰ اسلامی روایات سے متصادم ہونے کے علاوہ ذاتی طور پر بھی احمقانہ اور غیر معقول ہے۔ وہ کون سا انسان ہے جو فرد کے معاملات کو معاشرہ سے الگ کر سکے اور یہ طے کر سکے کہ یہ مسائل افراد سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ مسائل اجتماع سے۔ جبکہ اجتماع افراد کے مجموعہ ہی کا نام ہے۔ اور افراد کا کوئی مسئلہ اجتماع سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

مثال کے طور پر سرمایہ دارانہ نظام ایک اجتماعی تنظیم ہے جس کا معاشی
زندگی کو آزادی کی بنیادوں پر منظم کرنا ہے جس کا مظاہرہ سرمایہ دار اور عامل
(ایجنٹ) سود خوار اور مقروض کے معاملات کی شکل میں ہوتا ہے اور یہ سب افراد
اور یہ سب افراد کے مسائل ہیں جس کی اصل "نظام" اجتماعی ہے۔

یہی حال شریعت اسلام کا ہے کہ وہ افراد کے سلوک کو منظم کرتی ہے اور
یہ طے کرتی ہے کہ کس مال کو بطور قرض لینے کسی شخص کو اجیر بنانے یا کسی وقت خود
مزدوری کرنے میں انسان کا انداز کیا ہونا چاہیئے۔ اور یہ مسئلہ افرادی ہونے کے
باوجود اجتماعی تنظیم سے تعلق رکھتا ہے جہاں معاملہ میں طرفین کے برتاؤ کو طے
کرنا ہوتا ہے۔

افراد کے سلوک کو اجتماع سے الگ کر دینا ایک قسم کا تناقض ہے جس کا
امکان نہیں ہے۔ اسلامی شریعت کا "افرادی سلوک" کے منظم کرنے کے بارے
میں اعتراف کر لینا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس میں اجتماعی تنظیم بھی پائی
جاتی ہے۔

انطباق

روایات وارشادات کے علاوہ ہماری سمجھ میں یہ بھی نہیں آتا کہ اسلامی اقتصادیات
کے منکرین اس دور کے بارے میں کیا کہیں گے جب اسلامی قانون مکمل طور پر نافذ
کیا گیا تھا اور اس کے دائرۂ عمل میں اقتصادیات بھی شامل تھے کیا ان لوگوں
کے خیال میں صدر اسلام کے مسلمان ایک اسلامی اجتماعی زندگی نہیں گزار رہے تھے

اور کیا ان کا اپنا کوئی نظام نہیں تھا؟ کیا اس اجتماع کی قیادت سرکار دو عالم اور اسلام کے ہاتھ میں نہیں تھی؟ کیا اس قیادت کے پاس سماج میں پیدا ہونے والے پیداوار اور تقسیم کے مسائل کا حل نہیں تھا؟ اور اگر تھا تو اسلامی نظام کے دعوی کا اور کیا مقصد ہو سکتا ہے۔ اور ہم اس کے علاوہ اور کیا ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ہمارا مقصد تو یہی ہے کہ سرکار عالم کے دور میں اسلامی معاشرہ موجود تھا اور اس کا تصور اقتصادی نظام کے بغیر ناممکن ہے۔ وہ کون سا معاشرہ ہے جس کا اقتصادی نظام غیر اسلامی ہے اور پھر معاشرہ اسلامی کہا جاتا ہے معاشرہ پر سرکار دو عالم کی حکومت اور آپ کی نگرانی دلیل ہے کہ اس کے اقتصادی قوانین بھی آپ ہی کے قول و فعل و تقریر و تصدیق سے ماخوذ تھے اور آپ معاشرہ میں جو انداز اختیار فرماتے تھے اسی انداز پر سارا معاشرہ چل رہا تھا اور یہی معنی اسلامی اقتصادیات کے وجود کے ہیں۔

نظام کو تشکیل کی ضرورت ہے

البتہ اسلام میں نظام اقتصادیات کے وجود سے ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ اسلامی تشریعات و روایات میں اقتصادیات کے مسائل اپنی مخصوص شکل اور مخصوص اصطلاح کے ساتھ موجود تھیں۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اسلامی نظام اقتصادیات سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی قوانین میں ایسے ارشادات پائے جاتے ہیں کہ جنہیں مرتب کرکے فنی تشکیل دے دی جائے تو ایک مرتب نظام معیشت سامنے آسکتا ہے۔ اس کے پاس پیداوار، تقسیم اور تبادلہ وغیرہ

کے تمام احکام موجود ہیں۔ صرف جدید تشکیل اور ترتیب کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر اسلام میں بنجر زمینوں کی آباد کاری کے مسائل۔ کان بر آمد کرنے کے مسائل کرایہ، مضاربہ، سود، زکوٰۃ، خمس، خراج، بیت المال وغیرہ کے مسائل ایسے ایسے ہیں جنہیں مرتب کر لیا جائے اور ان کے اصول و نظریات کا استنتاج کر لیا جائے تو ایک اقتصادی نظام تشکیل پا سکتا ہے۔

یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اسلام میں سرمایہ داری کی معاشی حریت" کے مقابلہ میں کوئی صریحی قانون موجود ہو اور اسلام یہ اعلان کرے کہ ہم معاشی میدان میں حریت یا خلاف حریت کے قائل ہیں۔ اس نے ایسے احکام و قوانین بیان کر دیئے ہیں جن کی روشنی میں یہ دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں معاشی حریت کا بدل کیا ہے۔ اور وہ اقتصادی نظام کو کن بنیادوں پر استوار کرنا چاہتا ہے مثال کے طور پر اسلام کا سودی کاروبار کو حرام کر دینا۔ زمین کو آباد کاری اور محنت کے بغیر اپنی ملکیت میں داخل کرنے سے منع کر دینا، حاکم اسلام کو قیمتوں کے تعین کا اختیار دے دینا۔ اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ اسلام اقتصادی آزادی کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے۔ اور وہ اس کے موافق ہے یا مخالف

اقتصاد کا اخلاقی پہلو

بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ اسلام میں اقتصادی نظام کا وجود نہیں ہے اور جس شے کو اقتصادی نظام تصور کیا جاتا ہے وہ ایک اخلاقی نظام ہے جس کے ذریعہ اسلام مسلمان کے نفس کی تربیت اور اس کا تزکیہ کرنا چاہتا ہے،

وہ جس طرح دین و مذہب ہونے کے ناطے مسلمان کو صداقت و امانت کی تعلیم دیتا ہے صبر و حسنِ اخلاق پر آمادہ کرتا ہے جعلسازی اور چغلخوری سے منع کرتا ہے۔ اسی طرح انھیں غرباء کی امداد اور فقراء کی اعانت کا حکم دیتا ہے۔ ظلم کرنے سے منع کرتا ہے اور مال داروں کو بیچارے انسانوں کے لئے ہمدردی پر آمادہ کرتا ہے۔ انھیں دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے روکتا ہے اور ناجائز طریقے سے دولت جمع کرنے سے باز رکھتا ہے۔ نماز روزہ کی طرح کچھ مالی عبادتیں بھی مقرر کر دیتا ہے تاکہ مسلمان کے اخلاقیات درست ہوں۔ اس کا رشتہ پروردگار اور بندگانِ پروردگار سے مضبوط ہو اس کے دل میں نیکی کے جذبات تربیت پائیں اور وہ ایک نیک اور صالح انسان بن جائے۔

اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے پاس کوئی مستقل معاشی تنظیم ہے اور پورے معاشرے کو معاشی اعتبار سے ایک مخصوص راستہ پر چلانا چاہتا ہے۔ اخلاقی تعلیمات افراد کی اصلاح کے لئے ہوتے ہیں اور اقتصادی نظام معاشرہ کی تنظیم کے لئے۔ اخلاقی تعلیمات کو دیکھ کر اجتماعی نظام پر استدلال نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس کا وجود ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اخلاقیات اور اقتصادیات کا فرق ایک واعظ اور مصلح کا فرق ہے۔ واعظ کا کام منبر پر جاکر لوگوں کو رحم و کرم کی دعوت دینا اور ظلم و بدسلو کی سے روکنا ہے اس کی ذمہ داری سماجی اصلاح نہیں ہے۔ سماجی مصلح موعظہ نہیں کرتا۔ نیک و بد کا اعلان نہیں کرتا۔ بلکہ ایک نظام تشکیل دیتا ہے اور ایسے حقوق و فرائض معین کرتا ہے جسکی روشنی میں سماج ایک مخصوص راستہ پر

پر چل سکے۔

لیکن اس پوری تقریر کا واضح سا جواب یہ ہے کہ اسلامی ارشادات اس توجیہہ سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہیں کہ اس کے تمام بیانات کو چند اخلاقی تعلیمات پر محمول کر دیا جائے اور اس کے پیچھے کسی نظام کا اعتراف نہ کیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اخلاق کا پہلو بہت واضح اور نمایاں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام کے پاس اخلاقی تعلیمات کا ایک ذخیرہ ہے جس سے انسانی زندگی کے تمام شعبوں میں کام لیا جاتا ہے اور انھیں اقتصادیات میں بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مسلمان کے نفس کے تزکیہ اور اس کے دل کے اندر جذبات کی خیر کی تربیت کے لئے بہترین طریقہ اختیار کیا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنیٰ ہرگز نہیں ہیں کہ اسلام صرف افراد کی تربیت پر توجہ دیتا ہے اور اجتماع کی تنظیم نہیں جانتا۔ وہ صرف ایک واعظ منبر ہے اور اسے اصلاح معاشرہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اسلام نے ظلم و عدل کے تصورات کی حد بندی اور حقوق کی تحدید کئے بغیر لوگوں سے ظلم وستم سے روکنے اور عدل و انصاف پر آمادہ کرنے کا کام نہیں کیا۔ اس نے ظلم و عدل وحق کے مفاہیم کو مبہم اور گنجلک نہیں چھوڑا اور نہ ان کی تفسیر کا کام کسی اور نظام کے حوالہ کر دیا ہے جیسا کہ واعظین کرام کا کام ہوتا ہے۔ اس نے ان تمام الفاظ کے معانی بھی معین کئے ہیں۔ معاملاتِ زندگی میں ان کی حدیں بھی مقرر کی ہیں اور یہ بتایا ہے کہ پیداوار

اور تقسیم یا تبادلہ میں کس طریقۂ کار کو عدل کہا جاتا ہے اور کسے ظلم ، کس کا کیا حق ہے اور کس چیز کو حق سے تجاوز کہا جاتا ہے۔

وہ واعظ نہیں ہے۔ مذہب اور نظام ہے۔ واعظ عدل کی دعوت اور ظلم کی ممانعت کا کام انجام دیتا ہے لیکن عدل و ظلم کے معیار کو معین نہیں کرتا یہ کام عرف عام اور قانون کے حوالہ کر دیتا ہے جسے واعظ اور سامعین سب جانتے ہیں۔ لیکن نظام کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے اس میں عدل و ظلم کے معیار معین کئے جاتے ہیں اور انہیں معاشی زندگی پر منطبق کرنے کے طریقے طے کئے جاتے ہیں۔

اسلام اگر یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ ظلم چھوڑ دو۔ عدل کو نافذ کرو دوسروں پر زیادتی نہ کرو۔ اور ظلم و عدل کی تحدید کا کام لوگوں کے حوالہ کر دیتا کہ وہ طے کریں کہ عدل کس طرح مجسم ہوتا ہے اور ان کے حالات و معارف و اقدار کی روشنی میں عدل کے تقاضے کیا ہیں تو یقیناً اس کا مرتبہ ایک واعظ کا ہوتا اور بس۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ جب ظلم کے ترک کرنے اور عدل کے نافذ کرنے کا حکم دیا تو پہلے عدل و ظلم کے مفاہیم طے کئے پھر پیداوار، تقسیم، تبادلہ میں عدل کے طریقہ کو ظلم کے طریقے سے الگ کیا اور پھر قوانین نافذ کئے۔ مثال کے طور پر اس نے اعلان کیا کہ زمین پر طاقت کے زور پر قبضہ کر لینا اور اس میں آباد کاری کی زحمت نہ کرنا ظلم ہے اور اسے آباد کاری کے ذریعہ قبضہ میں لینا جائز ہے۔ سرمایہ پر فائدہ کے نام سے سود لینا ظلم ہے اور اس کے فائدے میں شریک ہو جانا عدل ہے۔

اور پھر اس کے بعد عدل کی دعوت دی اور ظلم سے منع کیا۔

یہ صحیح ہے کہ اسلام نے مالداروں کو غریبوں کی اعانت و ہمدردی پر آمادہ کیا ہے اور انھیں ہمسایہ فقراء کے ساتھ نیک برتاؤ کی دعوت دی ہے اور یہ ایک بہترین اخلاقی تربیت ہے۔ لیکن اس نے بات کو اس حد پر نہیں چھوڑا کہ اسے صرف اخلاقی تعلیم کہدیا جائے بلکہ حکومت کی ذمہ داری بھی قرار دی ہے کہ فقراء کے رزق کی ضمانت دے اور ان کے لئے سامان زندگی فراہم کرے اور اس ذمہ داری کو اپنے معاشی نظام کا ایک جزء قرار دے دیا۔

امام موسیٰ بن جعفرؑ مال زکوٰۃ میں والی کے فرائض کی تحدید کرتے ہوتے ارشاد فرماتے ہیں کہ " والی کا فرض ہے کہ وہ ان اموال کو لے کر ان آٹھ وجوہ میں صرف کرے جن کی طرف قرآن حکیم نے اشارہ کیا ہے۔ (فقراء، مساکین عاملین زکوٰۃ، مؤلفۃ القلوب، غلام، مسافر غربت زدہ، مقروض فی سبیل اللہ) اور فقراء و مساکین کو اس مقدار میں دے کہ وہ سال بھر کے خرچ سے بے نیاز ہو جائیں اور ان پر کوئی تنگی نہ رہ جائے اس کے بعد اگر بچ جائے تو والی کے اختیار میں ہے اور کم پڑ جائے تو والی کا فرض ہے کہ اپنے پاس سے پورا کر کے انھیں مستغنی بنائے۔

اس روایت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ معیشت کی ضمانت دینا اور بہترین زندگی کا فراہم کرنا صرف واعظانہ فکر نہیں ہے بلکہ ایک والی مملکت کی ذمہ داری ہے جس کا تعلق پورے معاشرہ کی اصلاح سے ہے اور معاشرہ

ہی کے ایک پہلو کا نام اقتصادی تنظیم ہے۔
یاد رکھیے کہ ہمارے پاس یہ روایت بھی ہے کہ اس شخص کا ایمان خدا اور آخرت پر نہیں ہے جو خود شکم سیر ہو کر سو جائے اور اس کا ہمسایہ بھوکا رہے" لیکن یہ روایت گزشتہ روایت سے مختلف ہے۔ اس میں صرف فرد کی اخلاقی تربیت ہے اور اس میں والی کی ذمہ داری بھی ہے۔ فرد کی تربیت کو واعظانہ عمل کہا جا سکتا ہے لیکن سماج کی تشکیل و تنظیم کو واعظانہ عمل نہیں کہا جا سکتا۔ اور نہ اس کی معاشی نظام کے علاوہ کوئی معقول توجیہہ کی جا سکتی ہے۔
یہ صحیح ہے کہ زکوٰۃ نماز روزہ کی طرح ایک عبادت ہے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کا اقتصادی تنظیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ زکوٰۃ انفرادی عمل ہوتا تو اسے والی مملکت سے متعلق نہ کیا جاتا۔ والی سے متعلق کر کے عمومی ضمانتِ زندگی کا ذریعہ بنا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ زکوٰۃ تمام دوسری عبادتوں سے الگ اسلامی نظامِ معیشت کا ایک جزء ہے۔ اور اس کی حیثیت فقط اخلاقی نہیں ہے اس کے علاوہ خود زکوٰۃ کی تشریع کا انداز بھی اس بات کی دلیل ہے کہ اسے اجتماعی نظام کا ایک جزء بنا دیا گیا ہے مثال کے طور پر زکوٰۃ کے بارے میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ وہ ناداروں کو اس مقدار میں دی جائے کہ زندگی کی عام سطح تک آ جائیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کی نگاہ میں زندگی کی ایک سطح ہے اور وہ سارے معاشرہ کو اس سطح تک لانا چاہتا ہے اور اس نے فقراء کو وہاں تک لانے کے لئے زکوٰۃ کو ذریعہ بنایا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ کام واعظ کا نہیں ہے مصلح کا ہے۔ اسلام ایک تنظیمی فکر ہے اس کی تعلیمات صرف اخلاقی تعلیمات نہیں ہیں۔ اگرچہ ان میں اخلاقیات کا عنصر نمایاں طور پر نظر آتا ہے اور یہ اس کے اسلوب تنظیم کا شاہکار ہے۔

اسلامی نظام کا نقص؟

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلامی اقتصادیات کے منکرین سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بارے میں اس قدر سخی کیوں ہیں۔ کہ انھیں بلاتامل اقتصادی نظام کا لقب دے دیتے ہیں۔ اور اسلامی قانون کے بارے میں اس قدر بخیل کیوں ہیں کہ اسے اس لقب سے محروم کر کے صرف اخلاقی تعلیمات کا نام دیتے ہیں۔

کیا سرمایہ داری اور اشتراکیت میں کوئی ایسی خصوصیت پائی جاتی ہے جو اسلام میں نہیں ہے کہ انھیں اس لقب سے سرفراز کر دیا جائے اور اسلام کو محروم کر دیا جائے جبکہ اسلام نے انہیں مشکلات کو حل کیا ہے اور ان ہی مسائل کا علاج کیا ہے جن کا علاج کر کے راسمالیت اور اشتراکیت نے نظام کا نام حاصل کر لیا ہے۔ مثال کے طور پر اقتصادی مذاہب میں اختلاف کا مرکز ایک ملکیت کا مسئلہ ہے کہ سرمایہ داری کی نگاہ میں ملکیت کی اصل شخصی ملکیت ہے اور ہر شخص کو ہر طرح کے ثروت کا مالک بننے کا حق ہے۔ اس کے خلاف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کوئی حتمی ضرورت

اجتماعی ملکیت پر مجبور کر دے۔ اور اشتراکیت کی نگاہ میں اصل اجتماعی ملکیت ہے۔ شخصی ملکیت صرف مخصوص حالات میں محدود طریقہ پہ جائز کی جا سکتی ہے۔

اسلام کا موقف ان دونوں سے بالکل مختلف ہے نہ وہ اس افراط کا قائل ہے اور نہ اس تفریط کا۔ اس کی نگاہ میں ملکیت کا تصور مرکب قسم کا ہے یعنی اس کے نظام میں ملکیت شخصی بھی ہے اور اجتماعی بھی اور دونوں ایک مرتبہ میں ہیں۔ کسی کی حیثیت استثنائی نہیں ہے۔ صرف مزار و ملکیت الگ الگ ہیں۔ شخصی ملکیت کی جگہ اور ہے اور اجتماعی ملکیت کا سرمایہ اور۔ جس کی تفصیل آئندہ کتابوں میں بیان کی جائے گی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام کے اس انداز میں کون سی کمی رہ گئی ہے کہ شخصی ملکیت کے اعزاز کو مذہب کہہ دیا جائے۔ اجتماعی ملکیت کے اعلان کو نظام کا نام دے دیا جائے اور مرکب ملکیت کے قانون کو نہ مذہب کہا جائے نہ نظام ۔ یہ ناانصافی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

دوسری مثال اکتساب کی ہے کہ "پیداواری آلات" کی ملکیت کے ذریعہ منفعت حاصل کی جا سکتی ہے یا نہیں۔

سرمایہ داری کا خیال ہے کہ اگر کوئی شخص پیداوار کے آلات کا مالک ہے اور اس کے ذریعہ کمانا چاہتا ہے تو اس پہ کسی طرح کی پابندی نہیں ہے ۔ وہ سرمایہ کو دے کر سود بھی لے سکتا ہے اور مشین کو کرایہ پہ دیکر کرایہ بھی لے سکتا ہے ۔ اگرچہ دونوں صورتوں میں اس

کا اپنا کوئی عمل اور اپنی کوئی محنت نہیں ہے۔

اشتراکیت نے ان دونوں طرح کے اکتساب کو حرام قرار دیا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اپنی محنت اور اپنے عمل کے بغیر دولت حاصل کرنا ظلم صریح ہے۔ وہ نہ مال دے کر سود کو جائز قرار دیتی ہے اور نہ مشین دے کر اجرت لینے کو۔

اسلام نے ان دونوں سے الگ راستہ اختیار کیا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ آلات کے ذریعہ بعض منافع جائز ہیں اور بعض حرام مشین کو اجرت پر دے کر کرایہ لینا جائز ہے اور مال کو قرض دے کر سود لینا حرام۔

ظاہر ہے کہ یہ تیسرا نظریہ ہے جو راسمالیت اور اشتراکیت سے مختلف ہے اور دونوں کے نظریات سے بالکل الگ بنیادیں رکھتا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ہی مسئلہ میں سرمایہ داری اور اشتراکیت کوئی رائے قائم کرے تو اس کا نام اقتصادی نظام پڑ جائے اور اسی مسئلہ میں اسلام کوئی طریقہ کار اختیار کرے تو اس کا نام اقتصادی مذہب یا نظام نہ پڑنے پائے۔ یہ ناانصافی نہیں ہے تو اور کیا ہے؟

جب کہ ایک ہی مسئلہ میں تین طرح کے نظریات ہیں۔ تو اگر دو نظریات اس بات کے اہل ہیں کہ انھیں اقتصادی نظام کا نام دیا جائے تو تیسرے کو بہرحال یہ حق ملنا چاہیئے اور اسے کسی قیمت پر اس نام سے محروم نہیں کیا جا سکتا۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی

* ریڈیو تہران کی اردو نشریات کا پروگرام

پاکستان	موسم سرما 41 میٹر بینڈ	7230 KHZ	شام سوا چھ سے سوا سات تک
	موسم گرما 25 میٹر بینڈ	11735 KHZ	شام سوا پانچ سے سوا چھ تک
ھندوستان	موسم سرما 41 میٹر بینڈ	7230 KHZ	شام پونے سات سے پونے آٹھ تک
	موسم گرما 25 میٹر بینڈ	11735 KHZ	شام پونے چھ سے پونے سات تک
بنگلا دیش	موسم سرما 41 میٹر بینڈ	7230 KHZ	شام سوا سات سے سوا آٹھ تک
	موسم گرما 25 میٹر بینڈ	11735 KHZ	شام سوا چھ بجے سوا سات تک

* مندرجہ بالا پروگرام ایران کے وقت کے مطابق روزانہ شام پونے پانچ بجے سے پونے چھ بجے تک نشر کیا جاتا ھے * * * * * *

پتہ .. انچارج اردو پروگرام " صدا و سیمائے جمہوری اسلامی ایران
پوسٹ بکس نمبر 200-98 تہران - ایران

یہ کتاب ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء کو
ایران کے اسلامی انقلاب کی چوتھی
سالگرہ کی مناسبت سے شائع
کی گئی ہے۔ اس موقع پر ہم اپنے
تمام مسلمان بھائیوں کو مبارکباد
پیش کرتے ہیں۔

۲۲ بہمن

انجمن اسلامی دانشجویان ایرانی، کراچی